مذہب اور ثقافت



نعمان نیئر کلاچوی

مذہب اور ثقافت

نعمان نیئر کلاچوی

نام مقالہ	مذہب اور ثقافت
مصنف	نعمان نیئرؔ کلاچوی
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی،ڈیرہ اسماعیل خان
پی ڈی ایف ایڈیشن	اگست،2026

فہرست

مذہب کی اساس

انسانی رویّہ جب معاشرے میں اپنے عملی اظہار سے گزرتا ہے تو وہ مذہب کی شکل اختیار کرلیتاہے اور اِسی کو بعض اوقات دین یا دھرم بھی کہہ دیاجاتاہے۔ انگریزی میں مذہب کیلئے اصطلاح Religion استعمال ہوتی ہے جس کے معنٰی دوبارہ جُڑنا ہے جو خالصتاً ایک صوفیانہ تصوّر ہے لیکن عام معنوں میں Religion کا مطلب ایک منظّم مذہب ہی لیاجاتاہے۔

دنیا کا ہر مذہب، دین یا دھرم دراصل ایک انسان کے مابعدالطبعی مکاشفات سے ارتقاء پذیر ہوتا ہے اور یوں کسی ایک انسان کا یہ مکاشفہ آہستہ آہستہ ایک منظّم مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے چنانچہ مذہب اپنی اصل میں انفرادی روحانی واردات سے شروع ہوکر سماجی اقدار، رہن سہن اور سیاسی قوّت سمیت تمام سماجی شعبہ جات پر محیط ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دنیا میں ہر انسان کا مکاشفہ مذہب یا دین نہیں بن جاتا بلکہ جسے عوامی قبولیت حاصل ہو جائے تو وہ مکاشفہ تہذیب کی شکل اختیار کرلیتاہے ورنہ کئی خدارسیدہ بزرگ اپنے مکاشفات سمیت اِس دنیاسے خاموشی کے ساتھ رخصت ہو جاتے ہیں۔

جہد للبقاء کے علاوہ انسان کا ایک بنیادی مسئلہ یہ رہا ہے کہ شعور سنبھالنے کے ساتھ ہی یہ علمی بحران (Knowledge Crisis) کا شکار ہو گیا ہے اور اپنے وجود اور اِس محیر العقول کائنات کے متعلّق سوائے قیاس کے اِس کے پاس کوئی معلومات نہیں تھیں۔ لیکن پھر اچانک انسان نے محسوس کیا کہ اُسے بغیر غور و فکر اور قیاس کے بھی کچھ معلومات مل رہی ہیں تو انسان پھر اُنہی اچانک منکشف ہونے والی معلومات پر بھروسہ کرنے لگا اور یہ انسان کی سب سے اوّلین علمی مجبوری تھی۔

چنانچہ سب سے پہلے انسان نے خدا کا تصوّر اپنے وجدان سے لیا اور بعد میں اپنا شعور استعمال کر کے اِس وجدانی مکاشفات کی توجیہ کرتا گیا۔ یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا خیال دراصل ایک انسانی مکاشفہ ہے اِس لئے یہی پھر انسان کیلئے ایک ناقابلِ تردید سچ بھی بن گیا۔

یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ تصوّرِ خدا انسانی شعور کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ مکاشفہ ہے بالکل جیسے انسان احساسِ محبت کو اپنی فکر سے ایجاد نہیں کرتا بلکہ وجدانی طور پر محسوس کرتا ہے۔ کچھ فلاسفہ کا خیال ہے کہ تصوّرِ خدا بھی دیگر تخیلات کی طرح انسانی قوتِ متخیلہ (Imagination Power) کی پیداوار ہے جبکہ تجربہ بتاتا ہے کہ یہ درست نہیں کیونکہ محض خیال یا استدلال یقین کی قوّت نہیں پیدا کر سکتے جب

تک اِس کیلئے انسان کے باطن میں ایک گہری بنیاد موجود نہ ہو۔ اِس لئے فلاسفہ کا یہ دعویٰ کہ خدا انسانی تخیل کی پیداوار ہے نہایت لغو اور بے بنیاد ہے۔ جس طرح احساسِ محبت، احساسِ ہمدردی، احساسِ حُسن و قُبح، احساسِ جمالیات انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہیں بالکل ایسے ہی خدا کا تصوّر یا احساس بھی انسانی فکر کی پیداوار نہیں ہے بلکہ فلسفہ میں تو خدا کے وجود کیلئے باقاعدہ سخت علمی دلائل موجود ہیں جیسے علّت العلل اور واجب الوجود کا استدلال مگر چونکہ یہاں یہ موضوعات ہماری بحث سے خارج ہیں اِس کیلئے آپ کو میرے دیگر علمی مقالات کا مطالعہ کرنا چاہیئے جن میں مَیں نے خدا کے وجود پر باقاعدہ علمی دلائل دیئے ہیں۔

پس خدا کا تصوّر انسانی ذہن کی ایجاد نہیں ہے بلکہ انسانی ذہن خود علمی طور پر ایک کامل تصوّر، کامل شعور اور کامل و واجب وجود کا محتاج ہے۔ آپ بھلے اِسے کسی بھی اصطلاح سے تعبیر کر لیں، جوہر میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے برِصغیر میں خدا کیلئے ایشور، بھگوان، پربھو اور دیو جیسی اصطلاحات بھی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ خدا تو اَنام ہے یعنی اُس کا کوئی نام نہیں بلکہ سب اچھے ناموں سے اُسے پُکارا جا سکتا ہے۔ خدا کے وجود پر اِس عامیانہ بحث کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ مذہب کا ظہور کیسے ہوتا ہے۔

☆☆☆

مذہب کا ظہور

مذہب اپنی ذات میں دراصل ایک انسان کے مکاشفات کا نام ہے۔ قرآن میں اِس کیلئے اصطلاح وحی استعمال ہوئی ہے۔ سنسکرت میں اِسے ایشور وانی کہتے ہیں اور انگریزی میں عموماً Revelation کہہ دیا جاتا ہے۔ مکاشفہ کو عام زبان میں مذہبی تجربہ یا خاص قرآنی اصطلاح میں نزولِ وحی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں محلِ نظر مذہب اسلام ہے اِس لئے مَیں مذہب اسلام اور اُس کی ہی مخصوص اصطلاحات بیان کروں گا۔ اسلام دین کا تنہاء مآخذ حضرت محمد ابن عبداللہ ہاشمی قریشی ﷺ کی ذات والا صفات ہے۔ آپ کا مکاشفہ یا وحی ہی اسلام میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ہماری ہی طرح کے ایک انسان تھے لیکن خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی نازل کی جاتی تھی۔ قرآن کی سورہ الکہف آیت 118 میں خدا کا ارشاد ہے کہ

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔

آپ کہہ دیجئے کہ مَیں آپ ہی کی طرح کا ایک انسان ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہے۔ پس جو کوئی اپنے ربّ سے ملاقات کی اُمید رکھتا ہے تو اُسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور اُس کی بندگی میں سے کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

یعنی قرآن کریم کا ایک ایک حرف مکاشفاتِ رسول میں سے ہے جس پر اعتماد کرنے والا مؤمن اور انکار کرنے والا دینی اصطلاح میں کافر کہلاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اوّلین مخاطب آپ کی اپنی قوم قریش تھی بعد میں یہ پیغام آپ نے مختلف علاقوں کے سربراہوں کو بطورِ دعوت پیش کیا۔ یوں اسلام حجاز سے نکل کر قریباً پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اسلام کیسے پھیلا اِس پر ایک طویل تاریخی بحث ممکن ہے لیکن یہ بھی میرا موضوع نہیں ہے۔ البتہ یہاں پر یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ دل کی دنیا جبر و استبداد سے نہیں بدلا کرتی فلہٰذا اسلام کے پھیلاؤ میں زیادہ تر صوفیانہ جہد کا بہت بڑا حصّہ ہے بالخصوص ہندوستان میں تو اسلام پھیلا ہی صوفیاء کرام علیہم التسلیم کی تعلیمات سے ہے۔

مذہب کا ظہور یعنی نزولِ وحی اپنی اصل میں خالصتاً ایک انفرادی تجربہ ہے جس میں کوئی بھی غیر نبی شریک نہیں ہو سکتا۔ مخاطب کا کام یہ ہے کہ وہ ہر طرح سے اپنی تسلّی کر لے کہ مدّعیِ نبوت کے دعوے کی نوعیت کیا ہے لیکن یہ بھی ایمان پیدا کرنے کیلئے کوئی اتنی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ اِس لئے کہ رسول اللہ ﷺ کو جھٹلانے والوں میں سے آپ کے قریبی رشتہ دار اور پڑھے لکھے مخاطب بھی شامل تھے فلہٰذا صرف نبوت کی معلومات حاصل کر لینے سے کسی انسان کے اندر ایمان اور تقویٰ پیدا نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ اب مَیں سمجھتا ہوں کہ ایمان ویقین کے معاملے میں علم و استدلال کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہے حالانکہ اسلامی عقائد پر میرا خالص علمی کام آپ انٹرنیٹ آرکائیو پر ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

آپ اگر رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے متعلق جانتے ہیں تو آپ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ اِن تیرہ سالوں میں سب سے سخت مخالفت کا سامنا آپ کو زعمائے قریش کے اُن پڑھے لکھے مخاطبین کی جانب سے کرنا پڑا جو خود کو عربی زبان واَدب کا ماہر اور بہت ذہین سمجھتے تھے۔ چنانچہ ابوجہل جس کا اصل نام عمرو ابن ہشام تھا کو قریشِ مکّہ ابوالحِکم یعنی دانائی کا باپ کہا کرتے۔ اِسی طرح ولید بن مغیرہ جیسا زیرک ادیب اور عتبہ بن ربیعہ کوئی کم سمجھدار لوگ نہیں تھے۔

پس اِن معلومات سے یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جنھوں نے پہلے پہل آپ کی رسالت پر اعتماد کا اظہار کیا اُن کے پیشِ نظر استدلال سے زیادہ باطنی آمادگی یا جسے وجدانی تجربہ یا مکاشفہ بھی کہہ سکتے ہیں ضرور رہا ہوگا ورنہ صرف نبوت کی خبر ایمان پیدا نہیں کرتی۔

یہ مسئلہ صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے اوّلین مخاطبین کو درپیش نہیں رہا بلکہ بعد کے زمانے کے لوگوں کیلئے بھی جوں کا توں موجود رہا جس کو حل کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے سو سال بعد ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جنہیں صوفیاء کہا جاتا ہے

اور جنہوں نے معلوماتِ نبوت یا رسول اللہ ﷺ کی سرگزشتِ اِنذار کو اپنے وجدان کے واسطے سے تجربہ کرنے کی کوشش کی جسے تصوّف کی اصطلاح میں کشف کہا جاتا ہے۔ یہ کشف دراصل نبوت کی پوری دعوت کو معلومات سے آگے لے جا کر ایک باطنی تجربہ بنا دیتا ہے اور اب مَیں اِسی کا قائل ہو چکا ہوں۔

متقدّمین میں امام ابوحنیفہ کے قابل شاگرد داوؑد طائی، معروف کرخی، ذوالنون مصری، سری سقطی، جنید بغدادی اور ابو بکر شبلی علیہم التسلیم اِسی صوفیانہ منہج کے زعماء تھے۔ علاوہ ازیں ابو بکر کلاباذی، ابو نصر سراج طوسی، ابو طالب مکی، عبد الکریم قشیری، پیرِ ہرات ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری ہروی، ابو الحسن علی ہجویری جُلّابی، امام غزالی، عبد القادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، ابو الفتوح شہاب الدین یحیٰی سہروردی، ابو حفص شہاب الدین عمر سہروردی، شیخِ اکبر ابن العربی الاندلسی، عبد الکریم جیلی، عبد القدوس گنگوہی، مُلّا صدرا، شاہ ولی اللہ دہلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، علامہ فضلِ حق خیر آبادی اور مولوی احمد رضا خان بریلوی علیہم التسلیم بھی اِسی منہج کے بزرگ تھے۔

اسلام میں صوفیانہ منہج کا سادہ مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت کو ایک زندہ تجربے کی حیثیت سے اپنے باطن سے دریافت کرنا جبکہ عموماً نبوت پر ایمان کی بنیاد یا تو محض روایت پر اندھا اعتماد ہوتا ہے یا پھر استدلال کے گھوڑے دوڑا کر کسی

نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے جس میں زبردست ٹھوکریں لگنے کا قوی اِمکان ہوتا ہے اور اِسی اِمکان پر امام غزالی نے اپنی معروف کتاب تہافت الفلاسفہ میں تفصیلی بحث کی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی نبی کی وحی کا مزہ صرف ایک صوفی ہی لے سکتا ہے کیونکہ اُس کا ایمان محض روایت یا استدلال کی بجائے اُس کے باطنی ذوق پر کھڑا ہوتا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ میں صوفیاء کا بہت احترام کیا جاتا رہا ہے اور علماء ہمیشہ صوفیاء سے فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ پوری اسلامی تاریخ میں جہاں محدّثین کے احادیث کے مجموعے، فقہاء کے فقہ کے دفتر اور متکلمین کے جبر و قدر اور خیر و شر کے کلامی دلائل کے انبار لگے ہوئے ہیں تو وہاں صوفیاء کرام علیہم التسلیم کے مکاشفات کے دفتر بھی موجود رہے ہیں۔

تصوّف کی پہلی باقاعدہ کتاب رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے تین سو سال کے بعد ہی منظرِ عام پر آجاتی ہے اور یہ نہایت معتبر حنفی ماتریدی فقیہ امام ابو بکر کلاباذی کی کتاب التعرّف لمذہب اہل التصّوف ہے جس کے متعلق الشیخ المقتول ابوالفتوح شہاب الدین یحیٰ سہروردی نے لکھا ہے کہ کتاب التعرّف نہ ہوتی تو شاید ہم صوفیانہ منہج کو کبھی نہ جان پاتے۔ گویا جس طرح حدیث اسلام کا تاریخی منہج ہے، کلام

اسلام کا استدلالی منہج ہے، فقہ اسلام کا قانونی منہج ہے، بالکل ایسے ہی تصوّف اسلام کا ذوقی منہج ہے اور ذوق علم و معلومات اور اخبار و تواریخ سے افضل و برتر ہے۔ بخدا مَیں اسلام کے مذکورہ تینوں مناہج میں سالوں سرگرداں رہا مگر مذہب کا لطف صرف صوفیانہ منہج ہی میں پایا۔ تصوّف آج بھی نبوتِ محمدی کو ایک زندہ تجربہ بنا دیتاہے اور یہ منہج ایک صوفی کو خدا اور رسول اللہ ﷺ سے ایسے جوڑ دیتاہے جیسے انسان کا قلب اُس کے سینے میں پیوست ہے۔

اگر آپ آج دنیا کے کسی بھی مذہب کی کھوج لگائیں تو آپ جان لیں گے کہ ہر مذہب دراصل ایک انسان کی باطنی واردات سے جنم لیتاہے پھر وہ انبیاء کرام علیہم السلام کا دین ہو یا پھر رام یا کرشن کا دین، مہاتما گوتم بدھ کا دین ہو یا پھر حضرت گرو نانک کا دین ہو پس اپنی اصل میں یہ سب اَدیان صرف ایک ہی انسان کے وجدانی تجربات ہیں۔ چنانچہ ایسا نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ، حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد ﷺ تو اللہ تعالیٰ سے علم پاتے ہیں اور گوتم بدھ یا گرونانک ریاضی پڑھ کر لوگوں کو اپنے دین کی تعلیم دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر نبی، اَوتار، سدگرو اور صوفی بزرگ خدا تعالیٰ کے فضل سے ہی علم پاتاہے اور جو نہیں پاتا تو اُس کا علم ریاضی کی طرح ظاہر بھی ہو جاتاہے۔

سچ تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ عربی، فارسی، ہندوستانی یا یورپین نہیں ہے بلکہ وہ تو ہم سب انسانوں کا واحد داتا و پروردگار ہے۔ وہی خالق ہے وہ پالنہار ہے۔ وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔ وہی ظہور بھی ہے اور مظہر بھی ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی پس انسان جدھر کا رُخ کرے تو اُسی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ قرآن اِس حقیقت کی گواہی کچھ یوں دیتا ہے کہ

فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ۔

پس تم جس طرف منہ پھیرو تو اُسی طرف اللہ کا چہرہ ہے۔

(سورہ البقرہ۔ آیت 115)

اِسی طرح گیتا ادھیائے 6 اور اشلوک 30 میں ہے کہ

جو مجھے ہر جگہ دیکھتا ہے اور ہر چیز کو مجھ میں دیکھتا ہے، مَیں اُس سے اوجھل نہیں ہوتا اور نہ وہ مجھ سے اوجھل ہوتا ہے۔

گروگرنتھ صاحب انگ 1349 میں ہے کہ

مالک پانی، خشکی اور آسمان ہر جگہ بھرا ہوا ہے۔ وہ ہر ہر دل میں موجود ہے۔

زبور باب 139 کی آیات 5 سے 10 میں یہ حقیقت کچھ یوں بیان کی گئی ہے کہ

5:تُو نے مجھے آگے پیچھے سے گھیر رکھا ہے اور تیرا ہاتھ مجھ پر ہے۔

6:یہ عرفان میرے لئے نہایت عجیب ہے۔ یہ بلند ہے مَیں اِس تک پہنچ نہیں سکتا۔

7:مَیں تیری روح سے بچ کر کہاں جاؤں یا تیری حضوری سے کدھر بھاگوں ؟۔

8:اگر آسمان پر چڑھ جاؤں توتُو وہاں ہے۔ اگر مَیں پاتال میں بستر بچھاؤں تو دیکھ !تُو وہاں بھی ہے۔

9:اگر مَیں صُبح کے پَر لگا کر سمندر کی اِنتہاء میں بسوں۔

10:تو وہاں بھی تیرا ہاتھ میری رہنمائی کرے گا اور تیرا داہنا ہاتھ مجھے سنبھال لے گا۔

المختصر مذہب کا ظہور صرف انسانی وجدان سے پھوٹتا ہے اور یہ وجدان انسان کی فکری قوّت یا متخیلہ کی ریاضت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا خاص انعام ہے جسے آپ وحی، الہام یا کشف کہہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

مذہب کی تعلیم

پس جب یہ طے ہو چکا کہ مذہب دراصل خدا تعالیٰ کی ایک انسان پر اپنی خاص علمی عنایت ہے تو پھر ضروری ہے کہ یہ تعلیم انسانیت کیلئے رحمت و نجات کا سبب بن جائے بلکہ بن جائے کیا رسول اللہ ﷺ کی بعثت آج ہمارے پاس ایک زبردست تاریخی گواہی ہے کہ کیسے خدا تعالیٰ کے تربیت یافتہ ایک سچے نبی کی تعلیم بدترین اخلاقیات کے حامل انسانوں کو وقت کا امام بنا دیتی ہے۔ پس ایک نبی کی بعثت کا مقصدِ اصلی کیا ہوتا ہے قرآن کی گواہی ملاحظہ فرمائیں۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔

وہی اللہ جس نے اِنہی اَن پڑھوں میں سے ایک رسول کھڑا کیا وہ اللہ کی آیات اِنہیں پڑھ کر سناتا ہے اور اِن کا تزکیہِ نفس کرتا ہے اور اِنہیں یعنی اپنے مخاطبین کو کتاب کا علم یعنی خدا کا قانون سکھاتا ہے اور اِس کی حکمت یعنی تعلیم میں پوشیدہ دانائی سکھاتا ہے اور اِس سے قبل تو یہ کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔(سورہ الجمعہ۔ آیت 2)

پس ایک نبی کی نبوت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کی اخلاقی تربیت کرکے اِنہیں اِس قدر پاک صاف بنا دے کہ اِن کا باطن روشن ہو جائے۔ بالکل یہی

تعلیم تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور رام و کرشن، گوتم بدھ اور گرونانک سرکار کی ہے یعنی دنیا کا کوئی بھی نبی، اَوتار، سدگرو اور صوفی بزرگ ہمیشہ سے خدا کے بندوں کو خدا کے ساتھ جوڑنے اور اپنے مخاطبین کے نفس کو پاکیزہ بنانے کی جہد کرتا رہا ہے۔ چنانچہ جس طرح انبیاء کرام علیہم السلام میں تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی بالکل اِسی طرح دنیا کے تمام اُن بزرگوں میں بھی تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی جنہیں خدا تعالیٰ نے اپنے خاص علم سے نوازا ہے اور جنہوں نے خلقِ خدا کی تعلیم و تربیت اور خدمت و تواضع کیلئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ خدا کی خاص رحمت ہو اُن تمام قدسی نفوس پر جنہوں نے انسان کو اِس دنیا میں جینے کے قابل بنایا۔

دنیا کا کوئی بھی مذہب انسان کو خدا سے جدا نہیں کرتا بلکہ اُسے خدا کے ساتھ ایک مسلسل زندہ تجربہ کی حیثیت سے جوڑے رکھتا ہے بشرطیکہ انسان علوم و اخبار سے آگے بڑھ کر اپنے باطن کو روشن کرلے ورنہ پوری زندگی قیل و قال میں گزر جائے گی لیکن پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ

وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ۔

اور وہ یعنی خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہوتے ہو۔

(سورہ الحدید۔ آیت 4)

پس یہاں پر خدا کی معیت نظری نہیں ہے کہ انسان ایک وہم پال لے کہ کوئی خدا اُس کے ساتھ ہے بلکہ یہ معیّت اور ساتھ ایک زندہ تجربے کی صورت میں ہی پایا جا سکتا ہے جس کیلئے صوفیانہ منہج پر چلنا پڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ صرف دین کا علم حاصل کر لینے یا دس پندرہ سو روایات یاد کر لینے سے ایک انسان خدا کی معیّت نہیں حاصل کر سکتا بلکہ اِس کیلئے کچھ اور طرح کا ذوق چاہیئے ہوتا ہے اور یہ ذوق صرف صوفیاء کرام علیہم السلام ہی کے پاس ہوتا ہے پس اگر اِس معاملے میں کوئی شک ہے تو کسی اللہ والے کی صحبت اختیار کر کے دیکھ لیں۔ ع

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

من کی دنیا تو صرف من چلے ہی بدل سکتے ہیں ورنہ قیل و قال سے تو ایک بچے کی تربیت بھی مشکل ہے۔

ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ دین یا مذہب محض علم و استدلال سے پلے نہیں پڑتا اور نہ ہی صرف روایت پرستی سے انسان کی دل کی دنیا بدلتی ہے بلکہ اِس کیلئے کسی اور طرح کی مشقّت درکار ہوتی ہے اور یہ مشقّت ہمارے صوفیاء کے ہاں آج بھی کی جارہی ہے اور خوش نصیب آج بھی فیض پا رہے ہیں۔ ع

محدود نہیں ہے اُن کا کرم پر بخشش اُن کے ہاتھ کی ہے

جتنا جسے چاہیں کر دیں عطاء یہ اپنی برائتیں ہوتی ہیں

بات یہ ہے کہ محض اخلاقی تعلیم اور نفس کی تربیت تو ایک خالص فلسفیانہ نظام کے ذریعے بھی سرانجام دی جاسکتی ہے پھر خدا کی تعلیم یعنی مذہب کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟،اِسی لئے خیالی بحث کو باطنی تجربہ تک پہنچایا گیا تا کہ انسان حقیقی طور پر بدل سکے۔ چنانچہ ارسطو کا فلسفہ ایک ذہین کیلئے محض نظری مشق کا انتظام تو کر دیتا ہے مگر اِس سے دل کی دنیا نہیں تبدیل ہوتی کیونکہ علم یا خبر سے یقین نہیں پیدا ہوتا بلکہ یقین کی اصلی بنیاد مذہبی تجربہ ہے جسے مَیں وجدانی یا باطنی تجربہ بھی کہہ دیتا ہوں۔ پس اِس کے علاوہ یقین تو نہیں پیدا ہوتا بلکہ انسان ایک وہم پال لیتا ہے جس کا باقی فائدہ تو ایک طرف یہ کھوکھلا یقین یا وہم خود انسان کے اندر کوئی معمولی سی تبدیلی بھی پیدا نہیں کرپاتا اور اِس وقت مذہبی معاشروں کا سب سے بڑا بحران یہی کھوکھلا یقین ہے۔

☆☆☆☆☆

ثقافت کی اساس

ثقافت جسے انگریزی میں آجکل Culture، اُردو میں تہذیب و تمدّن اور برّصغیر میں سنسکرتی کہا جاتا رہاہے دراصل کسی مقام پر لوگوں کے مخصوص طرزِ حیات کو کہتے ہیں۔ ثقافت دنیا کے ہر مذہب کی ماں ہے کیونکہ ہر مذہب اپنے عملی اظہار کیلئے ہمیشہ سے مقامی ثقافت کا محتاج رہا ہے۔ مقامی ثقافت سے مراد لوگوں کا وہ طرزِ حیات ہے جس کی بنیادیں اتنی صاف نہیں ہوتیں جس قدر مذاہب کی ہوتی ہیں اِس لئے ہر مذہب اپنی بقاء کیلئے ہمیشہ ثقافت کا محتاج رہتا ہے۔ یہ اُصول صدیوں پہلے بھی موجود تھا اور آج بھی من و عن موجود ہے۔

ثقافت مذہب کی طرح محض تعلیم و تربیت پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ اِس میں زبان، اَدب، موسیقی، روزمرّہ اطوار، خورد و نوش، تہوار حتیٰ کہ رہن سہن کا اَدنیٰ سے اَدنیٰ جز بھی شامل ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سے ایک قریشی عورت نے بحث کی کہ میرے شوہر نے مجھ سے ظِہار کر لیا تو اب مجھے بتایئے کہ مَیں اُس کی بیوی رہی یا نہیں رہی، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے عذر پیش کیا کہ اِس معاملے میں میرے پاس ابھی خدا کی ہدایت نہیں آئی لیکن وہ آپ سے مسلسل استفسار کئے جا رہی تھی کہ بالآخر رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی اور آپ نے فیصلہ سنا دیا۔

اِس قضیہ کی تفصیل قرآن کی سورہ المجادلہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پس اِس خاص واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ثقافت مذہب سے پہلے موجود ہے اور لوگ ثقافتی اقدار کی بہر حال اطاعت کر رہے ہیں۔ مذہب صرف ثقافتی اقدار کی اصلاح کرتا ہے یا اُن کی جگہ نئے اقدار وضع کر دیتا ہے تاکہ وہ ثقافت بن جائیں لیکن یہ کہ ثقافت سے ماوراء مذہب کا کوئی عملی اظہار ابھی تک دریافت نہ ہو سکا۔

اِسی طرح رضاعت یعنی کسی دوسرے کے بچے کو دودھ پلانا بھی عربوں کی معروف ثقافت تھی تو قرآن نے اِس معاملے میں قانون سازی تو کر دی مگر اصل قدر کو جاری رکھا۔ علاوہ ازیں نماز کا طریقہِ کار، حج، عمرہ، روزے کا مخصوص طریقہ اور خوردونوش، تہوار اور عام رہن سہن تمام کا تمام عرب ثقافت سے ماخوذ ہے۔ خاص کر حج اور عمرہ کی ثقافتی رسوم تو دنیا میں متعارف ہی عربوں نے کروائی تھیں۔ قرآن نے اِن میں جو غیر اخلاقی عناصر موجود تھے اُن کا خاتمہ کر کے ثقافتی رسوم کا تزکیہ کیا یعنی کعبہ کے گرد طواف کا عمل تو اسلام کے ظہور سے صدیوں پرانا ہے اور جو آج بھی جوں کا توں جاری ہے اور اِس میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہیں کی گئی۔

جس طرح مذاہب آسمانی اور وجدانی ہوتے ہیں بالکل اِسی طرح ثقافت بھی آسمانی اور وجدانی ہوتی ہے۔ ثقافت کسی ایک انسان کی ایجاد کردہ نہیں ہوتی بلکہ اِس کا

ظہور ایک ہی مقام پر مِل جُل کر رہنے والے لوگوں کے اطوار سے ہوتا ہے اور یہی انسان کی اصلی پہچان ہوتی ہے۔ نظریا فکر انسانی شناخت کا وہ مظہر نہیں ہے جس کی وساطت سے انسان کی شناخت ممکن ہو سکے بلکہ اَدیب اور فلسفی بھی اپنی ثقافت کے محتاج ہوتے ہیں چنانچہ ارسطو اور افلاطون جیسے بزرگ فلاسفہ کو بھی یونانی ثقافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالکل اِسی طرح ورھمان مہاویر اور گوتم بدھ کو برّ صغیر کی مخصوص سناتن دھرم کی سنسکرتی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس اور اسلام کو بھی عرب کی مخصوص ثقافت سے الگ دیکھ کر نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ قرآن نے تو ثقافت کیلئے ایک مخصوص اصطلاح استعمال کی ہے جسے "عُرف" کہا گیا ہے۔ عُرف دراصل قرآن کی وہ ثقافتی اقدار ہیں جنہیں ہم آجکل کی مروّجہ زبان میں Cultural Values کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی میں شریعت یعنی قانونِ خداوندی کے ساتھ ساتھ ابتداء ہی سے عُرف یعنی مقامی ثقافت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کیونکہ کوئی بھی مذہب مقامی ثقافت کے ساتھ موافقت کے بغیر اُس معاشرے میں اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ باشعور مصلح ابتداء ہی سے مذہب اور ثقافت کے تصادم کو جان گئے تھے اور اِس کا حل یہی نکالا کہ مذہب کو مقامی ثقافت کے ساتھ موافق کرنا ہی

مذہب کی بقاء ممکن بنا سکتا ہے۔ خود قرآن نے بھی رسول اللہ ﷺ کو مقامی ثقافتی اقدار کی اطاعت کی تلقین کی تھی۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ۔

اے نبی! در گزر کیجئے اور عُرف کا حکم دیجئے اور جہلاء سے نظر پھیر لیجئے۔

(سورہ الأعراف۔ آیت 199)

قرآن کا عُرف دراصل دنیا کی ہر مقامی ثقافت کی وہ خاص قدر ہے جسے معاشرہ نیکی قرار دے چکا ہو۔ یہ کس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز اتفاق ہے کہ دنیا کے کسی بھی معاشرے میں کبھی بھی کوئی ثقافتی قدر ظلم اور جرم پر قائم نہیں رہی۔ پس اگر کسی معاشرے میں کوئی مقامی ثقافتی قدر میں ظلم اور جرم شامل بھی ہوا تو کسی نبی رسول یا مصلح و صوفی نے اُس قدر میں اصلاح کر دی یا پھر اُس قدر کا خاتمہ کر کے اُس کی جگہ ایک نئی قدر مروّج کر دی، جیسے کہ اسلام نے عربوں کی قدیم ثقافتی قدر ظِہار کا خاتمہ کر کے اِس کی جگہ طلاق کو مروّج کر دیا۔

ظِہار کا مطلب ہے کسی موقع پر غصّے میں آ کر اپنی بیوی کو ماں کہہ دینا اور اُسے اپنے اُوپر حرام کر دینا۔ اسلام نے نہ صرف اِس ثقافتی قدر پر سخت تنقید کی بلکہ اِس جگہ لوگوں کو ایک معقول اور اصلاح شدہ قدر دے دی کہ اگر اپنی بیوی سے الگ ہونا

ہی ہے تو غیر اخلاقی حرکت کرنے کی بجائے سیدھی طرح طلاق کا راستہ اختیار کر کے عزت کے ساتھ الگ ہو جاؤ۔

پس مذہب دنیا کے ہر معاشرے میں ثقافتی اقدار کی اصلاح کیلئے ظاہر ہوتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مذہبی اقدار مقامی ثقافت کا اَٹوٹ حصّہ بن جاتی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کا اَٹل قانون ہے کہ دنیا کا کوئی بھی معاشرہ زیادہ دیر تک ظلم پر مبنی ثقافتی اقدار کا حامل نہیں رہتا اور جلد یا بدیر اقدار کی اصلاح ہو ہی جاتی ہے۔

☆☆☆

ثقافت کا ظہور

اِس وقت ہمارے پاس کوئی ایسی مستند اطلاع موجود نہیں ہے کہ پہلے پہل ثقافت کیسے نمودار ہوئی لیکن ایک بات تو قطعی ہے کہ ثقافت منظّم مذاہب سے قدیم رویّہ ہے اور اِس وقت کے تمام منظّم مذاہب دراصل اپنی اپنی مقامی ثقافتوں کے اثر میں زندہ ہیں۔ چنانچہ عرب خطّے سے نمودار ہونے والا مذہب اسلام، برّصغیر کی مٹی سے پھوٹنے والے سناتن دھرم، بدھ مت، جین مت، سِکھ مت، اَدویت ویدانت، جاپان کا شنتو مت، چائنہ کا تاؤمت، یورپ میں کیتھولک عیسائیت، مشرقِ وسطیٰ کی یہودیت اور فارس کا دینِ زرتشت اور دینِ مانی دراصل اپنی اپنی مقامی ثقافتوں کے اعلیٰ ترین مظاہر ہیں۔

مذہب ثقافت کا مظہر ہوتا ہے نہ کہ ثقافت مذہب کی ایجاد کیونکہ مذہب کا بنیادی کام اصلاحِ معاشرہ رہا ہے اور اصلاح زیادہ تر تجریدی (Abstract) نوعیت کی ہوتی ہے۔ مثلاً اسلام کی توحیدیت کسی بھی خطّے میں آج تک باقاعدہ کسی مقامی ثقافت کا حصّہ نہ بن سکی اور برّصغیر میں پہنچ کر یہ صوفیانہ منہج میں ڈھل گئی۔ پس اِس میں کوئی برائی نہیں کیونکہ محض ایک تجریدی تصوّر انسان کی روحانی ضروریات پوری نہیں کر سکتا اور اُسے کسی نہ کسی ثقافتی مظہر میں ڈھلنا ہی ہوتا ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام پہلے پہل صوفیاء کرام علیہم السلام کی وساطت سے ہی پہنچا ہے اور یہاں کے لوگوں کا اسلام سے پہلا تعارف صوفیانہ منہج کے واسطے سے ہوا ہے گو کہ بعد میں اِس منہج کے خلاف بھی مقامی تحریکیں اُٹھ کھڑی ہوئیں لیکن آج تک کامیابی صرف اُسی قدیم صوفیانہ منہج کے حصّے میں آئی ہے یعنی آج بھی برّ صغیر کی مسلم اکثریت صوفیانہ منہج کی ہی پیروی کر رہی ہے۔

دیکھا جائے تو یہ ایک بالکل فطری رویّہ ہے کہ انسان چاہ کر بھی اپنی ثقافت سے بغاوت نہیں کر سکتا کیونکہ ثقافت مذہب کی طرح شخصی اصلاح سے ارتقاء پذیر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ برّ صغیر پاک و ہند اور بنگلہ دیش کے کوئی سے سو مسلم جمع کر لیں تو اُن میں پانچ سلفی ہوں گے، دس دیوبندی اور باقی پچاسی صوفیانہ منہج کے حامل ہوں گے کیونکہ عوام کی اکثریت قیل و قال کے بکھیڑے نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ ہی ایک عام آدمی کے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مسلک کے مولوی کے پاس جا کر اُس سے اُس کا مخصوص منہج سیکھ سکے۔ پس ثقافت کا ظہور فطری ہے اور مذہب کا ظہور اصلاحی و اختیاری ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلے وہابی تحریک اور بعد میں دیوبندی تحریک پورے زور و شور سے برپا ہوئی لیکن آج بھی اکثریت صوفیانہ منہج کی ہی پیروی کرتی ہے اور اب تو

اسلام کا استدلالی شاہ ولی اللّٰہی منہج یعنی دیوبندیت اور روایتی سلفی منہج سخت علمی تنقید کی زَد میں ہے اور اِس سخت ملحدانہ تنقید کی سرکوبی کیلئے جدید معتزلہ روش یعنی پرویزیت، مودودیت اور غامدیت علمی میدان میں اپنے جوہر دکھا رہی ہے لیکن پھر بھی بات کچھ بنتی نہیں دکھائی دے رہی۔

بات یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب کبھی بھی محض تجرید سے نہیں چل سکتا چنانچہ ہر مذہب کو ہمیشہ سے مقامی ثقافت کا لباس درکار ہوتا ہے ورنہ مذہب افلاطونی فلسفہ بن کر تاریخ کے اوراق میں کہیں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہابیت اور دیوبندیت بنیادی طور پر اصلاحی تحاریک تھیں لیکن چونکہ اِن تحاریک کے کرتا دھرتا ہندوستانی ثقافت کو مذہب میں تحلیل کرنا چاہتے تھے اِس لئے یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور نتیجہ شدید ترین فرقہ واریت کی صورت میں نکل آیا گویا اصلاح خود ایک نیا فساد پیدا کر گئی۔ پس جس قدر ہندوستان میں مسالکِ اسلامیہ نے آپس میں ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل کی، مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایسی افسوسناک مذہبی روش پوری دنیا کی کسی ثقافت میں پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔

☆☆☆

برّصغیر میں مسلم ثقافتی اقدار

ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ تو تلوار سے پھیلا اور نہ ہی سیاسی جبر سے پھیلا بلکہ یہاں اسلام صرف اور صرف صوفیانہ منہج کے واسطے سے پھیلا۔ صوفیانہ منہج سے مراد اسلام کا ایسا خاص وجدانی منہج ہے جس میں دین علم یا خبر کی بجائے باطنی واردات کے تجربہ سے گزر کر ایمان ویقین پیدا کرتا ہے۔

معلوم تاریخ کے مطابق برّصغیر میں پہلے مسلم صوفی بزرگ ابوالحسن علی ہجویری جلّابی المعروف داتا گنج بخش ہندوستان تشریف لاتے ہیں۔ آپ گیارھویں صدی عیسوی کے وسط میں خراسان کے ایک غیر معروف دیہات جُلّاب سے ہندوستان کے معروف شہر لاہور تشریف لائے اور یہیں پر بیٹھ کر مختلف ہندو اقوام کو صوفیانہ منہج کے واسطے سے مسلمان کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں کا اسلام سے یہ پہلا باقاعدہ تعارف تھا جسے یہاں کے نیک لوگوں نے سر آنکھوں پر قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے والوں میں اکثریت ویش اور شودر جاتی کی تھی۔

داتا گنج بخش کے علاوہ دوسری بڑی شخصیت جس نے ہندوستان کے گھر گھر میں اسلام کا تعارف پہنچایا اور جس کی دعوت کو ہر خاص و عام نے دل سے قبول کیا وہ شخصیت حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری علیہ التسلیم کی ہے۔ آپ بھی داتا

سرکار کی طرح تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں خراسان کے ایک دیہات چشت سے راجستھان کے علاقے اجمیر تشریف لائے اور پوری زندگی اِسی خطّے کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔ ایک عام روایت ہے کہ آپ کے دستِ مبارک پر قریباً نوّے ہزار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ میرے خیال میں یہ کوئی مبالغہ نہیں کیونکہ پورے ہندوستان میں تیرھویں صدی عیسوی کی پہلی دہائیوں میں اگر نو کروڑ ہندو موجود تھے تو اُس میں سے نوّے ہزار ہندوؤں کا اسلام قبول کرنا کوئی انوکھی بات نہیں۔ چلیں بالفرض نوّے ہزار کی تعداد گھٹا کر ہم اگر محض نو ہزار بھی کر دیں تو بھی یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔

کہنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام اَموی کمانڈر محمد بن قاسم ثقفی کی جارحانہ مہم سے نہیں پھیلا بلکہ خراسان سے آئے صوفیاء کرام علیہم التسلیم کی محبت و التفات سے پھیلا ہے۔ پس یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہندوستان میں صوفیانہ اقدار زیادہ پریکٹس کی جاتی ہیں۔ مثلاً پیری مریدی کا سلسلہ، زیاراتِ قبور، محفلِ نعت و حمد، سماع اور قوالی، لنگر اور عرس، قل، چالیسواں اور برسی کی خیرات، مختلف مذہبی ایام کی خیرات، گیارھویں شریف، میلاد اور نذر و نیاز تمام تر صوفیانہ اقدار ہیں جن پر آج بھی یہاں کی عوام بڑی محبت و عقیدت سے عمل کر رہی ہے۔

چنانچہ بہت بعد میں یہاں پر یعنی اُنیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں وہابی تحریک اور اُنیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں میں دیوبندی روش نے اِن تمام ثقافتی اقدار کو بدعات قرار دے کر تحلیل کرنے کی کوشش کی لیکن اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا مسلم معاشرہ شدید ترین فرقہ واریت اور بدترین مذہبی تعصّب میں مبتلا ہو گیا اور جس کا اثر آج بھی آرام سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مولوی شاہ محمد اسماعیل دہلوی اور دیوبند کے زعماء مولوی قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی کا بنیادی مؤقف یہ تھا کہ ہندوستان میں صوفیانہ ثقافتی اقدار کو مذہب سے الگ کر دیا جائے اور اِسے دین میں ایک نئی اختراع یعنی بدعت قرار دے کر ترک کر دیا جائے جبکہ اِس کے برعکس علّامہ فضلِ حق خیر آبادی اور مولوی احمد رضا خان بریلوی کا مؤقف یہ تھا کہ مروّجہ ثقافتی اقدار جو اب مذہبی اقدار بھی بن چکی ہیں کو بالکل بھی نہ چھیڑا جائے ورنہ استدلالی اور اصلاحی روش سے یہاں کا مسلمان آہستہ آہستہ پورے مذہبی اثر سے دور ہو جائے گا۔ پھر سچ تو یہ ہے کہ وہابی منہج، دیوبندی منہج، سر سید احمد خان، علّامہ اقبال، علّامہ پرویز احمد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جاوید احمد غامدی کی معتزلانہ روش نے آج ہندوستانی مسلمان کو الحاد کے دروازے پر پہنچا دیا اور حضرت علّامہ فضلِ حق خیر آبادی اور مولوی احمد رضا خان بریلوی کا خدشہ سچ ثابت ہو گیا۔

اصل میں یہ ایک مجرّب اُصول رہا ہے کہ مذہبی معاملات میں استدلال کارآمد نہیں ہوتا۔ استدلال صرف فلسفہ میں کارآمد ہو سکتا ہے کیونکہ فلسفہ ایک تخیّلاتی اور نظری علم ہے جس میں بنیادی اوزار ہی استدلال ہے جبکہ مذہب کی بنیاد استدلال نہیں یقین ہے اور یقین ریاضیاتی اُصولوں (Mathematical Principles) سے نہیں پیدا ہوتا۔ چنانچہ اگر کوئی ذہین مجھے یتیم کی مدد کرنے کیلئے سونا قابلِ تردید دلائل بھی دیدے پھر بھی میرے اندر خدمت کا جذبہ نہیں پیدا کر سکتا جب تک کہ میرے باطن سے ہمدردی کی روشنی نہ پھوٹ پڑے۔ پس علم و عقل فلسفے میں کام آجاتے ہیں لیکن مذہب میں صرف باطنی واردات ہی کارآمد ہوتی ہے اور اِسی کو پیدا کرنے کیلئے صوفیانہ منہج میں پیر یا شیخ تزکیہِ نفس کی ریاضت کرواتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک عام آدمی کبھی بھی کسی مذہب کے ساتھ محض تجریدی قسم کا تعلّق قائم نہیں رکھ سکتا جیسے فلاسفہ اپنے نظریات کے ساتھ رکھتے ہیں جبکہ ایک عام آدمی اپنے مذہب کو ایک زندہ تجربہ بنانا چاہتا ہے اور اِسی کیلئے اُسے نماز روزہ کے علاوہ دیگر ثقافتی اقدار پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے تاکہ اُس کا اپنے مذہب کے ساتھ ایک زندہ باطنی ربط قائم رہے۔ چنانچہ جب اصلاح کے نام پر مروّجہ ثقافتی اقدار جو مذہبی اقدار بھی بن چکی ہوتی ہیں کو چھیڑا جائے تو نتیجہ صرف مذہبی و سماجی انتشار کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔ مذہبی اقدار نتیجے کے اعتبار سے عموماً خیر پر مبنی ہوتی ہیں

مثلاً صوفیانہ منہج میں عرس کی روایت کا اصل مقصد ہی یہی تھا کہ غریب کو کسی دن بغیر مزدوری کئے پیٹ بھر کر کھانا مل جائے۔ اِسی طرح صوفیاء کے درباروں پر لنگر کا اہتمام بھی اِسی غرض سے کیا جاتا ہے تاکہ آس پاس کے غریب غرباء اگر محنت مزدوری کی طاقت نہیں رکھتے تو کسی دربار پر جاکر مفت کھانا کھالیں۔ بتایئے اب اِس میں کونسی اخلاقی و شرعی قباحت ہے؟، کیا قرآن میں بھوکوں کو کھانا کھلانا جرم قرار دیا گیا ہے؟ یا کسی غریب کو مفت کھانا کھلانا اخلاقی جرم ہے؟، اگر نہیں تو پھر اِسے بدعت قرار دے کر لوگوں کا ایمان خراب کرنے کا فائدہ کیا ہے؟۔

کہا یہ جاتا ہے کہ نذر و نیاز شرک ہے جبکہ توحید کا خالص تجریدی تصوّر آج تک ایک عام آدمی کے دماغ میں نہیں بیٹھ سکا کہ آخر توحید ہوتی کیا ہے۔ توحید کا یہ فلسفیانہ خیال تو شاید کسی ذہین کیلئے کارآمد ہو لیکن سوال یہ ہے کہ ایک عام آدمی کو کیسے سمجھایا جائے کہ توحید کسے کہتے ہیں اور اِسے کیسے پریکٹس کیا جاتا ہے۔ اِسی اُلجھن کے پیشِ نظر امام غزالی نے اپنی معروف کتاب احیاء العلوم میں توحید کے تین درجات مقرر کر دیئے تاکہ عوام توحید کو اگر سمجھنے سے قاصر ہو تو اُسے تجربہ میں لے آئے۔ چنانچہ توحید جب بھی ایک زندہ تجربے میں آتی ہے تو وہ کسی نہ کسی صورت میں ڈھل جاتی ہے اور اِسی کو اصطلاح میں شرک کہہ دیا جاتا ہے حالانکہ بُت پرستی سے زیادہ مُہلک نفس پرستی ہے۔ آخر کون صاحبِ عقل نہیں جانتا کہ

کارساز مطلق صرف اور صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی ہے کہ وہ قادرِ مطلق ہے جبکہ انسان جس قدر بھی ترقی کر لے وہ محتاج و مجبور ہے۔ شیخِ اکبر کا ایک معروف قول ہے کہ

العبدُ عبدٌ فإن ترقّیٰ والربُّ ربٌّ فإن تنزّل

یعنی بندہ تو بندہ ہی ہے پس جتنی ترقی کر لے اور خدا تو خدا ہی ہے پس زمین پر کیوں نہ اُتر آئے۔ پس کارساز مطلق تو خدا ہی ہے مگر خدا کا تجربہ بھی نبی کے واسطے سے ہوتا ہے یعنی واسطہ یہاں بھی ضروری ہے ورنہ کام ہی نہیں چلتا، تو اب نذر و نیاز کچھ بھی نہیں سوائے اُسی واسطہ کو پُکارنے کے، اب اگر نبوت، ولایت، صوفیت اور اَوترت شرک نہیں ہے تو پھر نذر و نیاز اور عرس و خیرات کیونکر شرک ہوئے؟۔

کہتے رسول اللہ ﷺ کی میلاد منانا بدعت ہے یعنی دین میں یہ ثابت نہیں ہے، تو کیا آج ہم سارے دینی کام وہی کرتے ہیں جو دین میں ثابت تھے؟، قطعاً نہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر زمین پر سجدہ کیا جبکہ آج پوری مسلم دنیا نرم و گداز قالین اور جانماز پر سجدے کر رہی ہے۔ اِسی طرح باجماعت نماز کے بعد اجتماعی دعا کرنا، اکثریت کا پیروں کا مسح نہ کرنا، نوافل کو واجب، سنتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ کی نئی شرعی حیثیت دینا، ناف تک لمبی داڑھی رکھنا، کُرتا پاجامہ اور شلوار پہننا، لاؤڈ

اسپیکر میں اذان اور خطبے دینا اور نماز پڑھانا، ملوکیت اور متغلّب کے سیاسی تسلّط کو جائز قرار دینا، رِبا اور سُود کی مختلف صورتوں کو جائز قرار دینا، آخر اِن میں سے کونسا مروّجہ عمل رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے؟، پس اِن میں سے کوئی ایک عمل بھی بدعت نہیں ہے لیکن کسی صوفی بزرگ کی برسی پر اپنے خرچے سے پانچ سات دیگیں پکا کر غریبوں میں بانٹنا بدعت ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ سے محبت و عقیدت کو زندہ رکھنے کیلئے محفلِ نعت اور خدا کی یاد کو دلّوں میں پیوست رکھنے کیلئے صوفیاء کا سماع و قوالی سننا بدعت ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ ع

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

یاد رکھنے کے قابل نکتہ یہ ہے کہ مذہب فلسفہ نہیں ہوتا اور نہ ہی تاریخ بلکہ مذہب خدا اور اُس کے برگزیدہ بندوں جن میں انبیاء کرام، صوفیاء کرام اور تمام نیک سیرت لوگ شامل ہیں سے ایک زندہ تعلّق کا نام ہے۔ اگر ثقافت نہ ہو تو بتایئے خدا سے جُڑنے کیلئے ایک عام آدمی کیا کرے؟، جواب ہو سکتا ہے کہ نماز پڑھے لیکن نماز سے پہلے تو ایمان اور یقین ہے جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا تو اب کیا کرے؟، چلیں مذہب کی ضروری معلومات بھی سیکھ لی ہیں لیکن پھر کیا؟، تو کیا صرف معلومات سے

یقین پیدا ہو جاتا ہے؟، بالکل بھی نہیں۔ علم و خبر سے یقین پیدا ہو جاتا تو آج مسلم معاشرے میں علماء بالخصوص اور عوام بالعموم بدترین اخلاقی سطح پر نہ پہنچ چکی ہوتی۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اِس وقت دنیا میں سب بدترین اخلاقی معاشرے مذہبی معاشرے ہیں جہاں اخلاقیات تو ایک طرف انسانیت کا دَم گھُٹ رہا ہے۔ ایسی بدترین مذہبی گھٹن میں بغیر یقین و ایمان کے کھوکھلی مذہبی رسوم سرانجام دیتے جانا قرآن کی اصطلاح میں منافقت کہلاتی ہے۔ چنانچہ مذہب کے معاملے میں سب سے پہلے ایمان یا یقین ہے بعد میں عمل۔ اِس کے برعکس فلسفہ اور تاریخ میں صرف معلومات حاصل کر لینا کافی ہے۔ المختصر مذہب بغیر یقین کے کوئی شے نہیں ہے اور یقین صرف علم و استدلال اور روایات کو رَٹ لینے سے پیدا نہیں ہوتا، پس اِس کیلئے مذہبی تجربہ اوّلین شرط ہے۔

☆☆☆

مذہب اور ثقافت کا تصادم

مذہب اُس وقت تک محض ایک خشک فلسفہ ہے جب تک کہ یہ مقامی ثقافت میں ڈھل کر ایک زندہ تجربہ نہیں بن جاتا۔ مثلاً خدا ایک ہے اُس وقت تک محض ایک خبر ہے جب تک کہ یہ خبر مذہبی تجربہ کی وساطت سے باطن میں پیوست نہ ہو جائے اور صرف یہ نہیں کہ باطن میں پیوست ہو جائے بلکہ اپنے اظہار کیلئے ثقافتی قدر میں ڈھل جائے تب کہیں جا کر مذہب کا مقصد پورا ہوتا ہے ورنہ مذہب ایک نظری فلسفہ رہ کر کتابوں میں کِرم خوردہ ہو جاتا ہے۔

قابل مصلح وہ ہوتا ہے جو مذہبی نظریات کو ثقافتی اقدار میں ڈھال کر ایک زندہ تجربہ بنا دے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خدا کی ہدایت سے قدیم عرب ثقافتی اقدار یعنی حج اور عمرہ میں نئی روح ڈال کر اُنہیں ہر خاص و عام کیلئے ایک زندہ مذہبی تجربہ بنا دیا بشرطیکہ یقین پیدا کر لیا جائے۔ پس یقین بنیادی شرط ہے۔ اگر یقین پیدا ہی نہیں ہوا یا یقین کے ساتھ شک بھی باطن میں جگہ بنا چکا ہے تو مذہب کسی بھی صورت کارآمد نہیں ہو سکتا اور ایسے شخص کی آخری پناہ جلد یا بدیر الحاد ہی ہوتی ہے۔ اِسی لئے صوفیاء پٹتے رہ گئے کہ مذہب کو استدلال کی کسوٹی پر مت پرکھو اور عقل کو دینیات میں رواج نہ دو ورنہ مذہب کے ساتھ ساتھ ثقافت سے بھی ہاتھ

دھو بیٹھو گے اور آج پھر کیا ہوا؟، یہی نا کہ اِس وقت پاکستان میں موجود جنریشن زی تیزی کے ساتھ الحاد کی جانب بڑھ رہی ہے۔

چنانچہ آج سر سید احمد خان اور علامہ اقبال کے فکری جانشین سر پکڑ کر بیٹھ گئے ہیں کہ استدلال کے سارے پینترے استعمال کرنے کے بعد بھی نئی نسل کو الحاد سے روک نہیں پا رہے ہیں تو اب کیا کریں۔ استدلال کی اِس بہتی گنگا میں اب تو دیوبندی مسلک کے فاضل بھی کود پڑے ہیں جو کبھی خود عقل و استدلال کو ثانوی قرار دیتے تھے۔ بہر حال یہ استدلالی کوششیں اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی ہو چکی ہیں اور اِن سے کبھی کوئی کارآمد نتائج نہیں نکلے کیونکہ مذہب انسان کی روحانی غذاء ہے نہ کہ عقلی و استدلالی۔

کوئی بھی مذہب جب ایک نئی ثقافت میں مدغم ہوتا ہے تو آہستہ آہستہ وہ اپنے وجود کو اُس مقامی ثقافت میں تحلیل کر لیتا ہے اور بعد میں وہی ثقافت ایک عام مذہبی کیلئے مذہبی تجربہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ جب تک کوئی مذہب مقامی ثقافت کے ساتھ موافقت پیدا کر کے چلتا رہے تو تفرقہ اور بے یقینی پیدا نہیں ہوتی تاوقتیکہ مذہبی عقائد میں اصلاح اور استدلال کی تحریک نہ شروع کر دی جائے اور یہی وہ خاص موقع ہوتا ہے جب مذہب اور ثقافت میں ایک زبردست تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں گیارھویں صدی عیسوی کی ابتداء سے لیکر اُنیسویں صدی کی پہلی دہائی تک یعنی اِن آٹھ سو سالوں میں پورے ہندوستان میں کوئی مذہبی تفرقہ یا ثقافتی انتشار دیکھنے کو نہیں ملتا۔ مذہبی تفرقہ اور ثقافتی انتشار پیدا ہی اُس وقت ہوا جب ہندوستان میں وہابی تحریک بپا کی گئی ورنہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی تک بھی کوئی شدید نوعیت کا تفرقہ موجود نہیں تھا کیونکہ شاہ صاحب ایک عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باعمل وحدت الوجودی صوفی بھی تھے۔

ہندوستان میں آٹھ سو سال تک صرف ایک ہی منہج پریکٹس ہوتا رہا اور وہ تھا صوفیانہ منہج۔ پس یہ وہابی تحریک، دیوبندی اور معتزلانہ روش اُنیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائیوں کی پیداوار ہے۔ ہندوستان کے آخری بڑے صوفی بزرگ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی تھے جن کے مریدین میں مسلک دیوبند کے فضلاء رشید احمد گنگوہی اور اشرف علی تھانوی کے علاوہ سکّہ بند پیر صاحب آف گولڑہ شریف سید مہر علی شاہ گیلانی بھی شامل تھے اور یہ وہ دَور تھا جب وہابی، دیوبندی اور معتزلانہ روش ابھی اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔

یہاں پر مَیں نے جان بُوجھ کر بریلوی مسلک کا ذکر نہیں کیا کیونکہ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہی دراصل اصلی ہندوستانی صوفیانہ منہج ہے جو پہلے دن سے ایک عام آدمی

پریکٹس کر رہا تھا گویا یہ ہندوستانی مسلمان کی ایک ڈیفالٹ مذہبی پوزیشن تھی جسے بعد میں وہابی، دیوبندی اور معتزلانہ روش نے متاثر کیا۔ چنانچہ آج بھی اگر آپ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرائیکی خطّے کے ایک دور دراز دیہات میں سے کسی ایک عام آدمی کا مذہبی منہج دیکھیں تو وہ خالصتاً صوفیانہ ہو گا کیونکہ یہی دراصل اصلی ہندوستانی منہج تھا۔ اصلاحی تحریکیں عموماً شہری آبادیوں کو متاثر کرتی ہیں اور دیہاتوں میں اِن کا اثر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اصلاحی تحریکوں نے مذہب اور ثقافت میں زبردست تصادم پیدا کیا اور یوں ایک عام ہندوستانی جو صدیوں سے اپنے مذہب کے ساتھ اپنی ثقافت کے ذریعے ایک زندہ تعلّق رکھتا تھا قیل و قال اور نظریاتی مباحث میں پھنس کر تھوڑا بہت رہاسہا ایمان بھی کھو بیٹھا۔

اِس پر مستزاد یہ کہ معتزلانہ روش نے مذہب کو بازیچۂ اطفال بنادیا، یقین نہیں تو آج غامدیت کا جائزہ لیکر دیکھ لیں۔ معتزلانہ روش کے حامل جاوید احمد غامدی نے آج اسلام کو یونانی فلسفہ بنا دیا اور نظریاتی قیل و قال میں مذہبی تجربہ چراغ لیکر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا۔ میرے خیال میں مذہب کے تابوت میں یہ آخری کیل تھی جو غامدی صاحب نے ٹھوک دی۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ چلو اچھا ہوا کہ مذہبی

معاملات میں استدلال کی کم مائیگی ظاہر ہو چکی ہے ورنہ ابھی نئی نسل کو معنویت کی کھوج کیلئے مزید پتہ نہیں کتنا عرصہ بھٹکنا پڑتا۔ پس اب اُمیدِ واثق ہے کہ جلد مذہب اور ثقافت کا یہ بدترین تصادم تحلیل ہو گا اور ایک بار پھر خالی الباطن انسان صوفیانہ تجربہ کی وساطت سے خدا اور مذہب کے ساتھ جُڑنے کی کوشش کرے گا کیونکہ انسان محض ایک جانور نہیں ہے بلکہ معنویت کا متلاشی ایک مظہرِ خدا ہے۔

اگر انسان آج اپنے جوہر (Essence) کو نہیں پہچانے گا تو شعور اُسے الحاد کے گڑھے میں پھینک دے گا پھر آخر میں علمی طور پر عدمیت (Nihilism) اور وجودی طور پر شدید باطنی اضطراب کے سوا انسان کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ پس ابھی بھی وقت ہے کہ انسان حیوانی وجود سے اُوپر اُٹھ کر اپنے جوہر کی معرفت حاصل کرے جہاں سے اُسے خدا کا پتہ بھی مل جاتا ہے اور تمام تر علمی و باطنی مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں ورنہ صرف پیسہ اور ٹیکنالوجی زیادہ دیر تک انسان کا اصلی مسئلہ دبا کے نہیں رکھ پائیں گے۔ ع

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہرِ ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

☆☆☆☆☆



سید المجاذیب خواجہ نعمان نیئرؔ کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں ۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کیئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری" ، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نور احمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔